نبوّت کی ضرورت

عبدالحمید صدیقی

(۸)

اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوتے ایک دوسرا مصنف سوسان سٹلینگ اپنی ایک مشہور تصنیف "تصورات اور خیالی پیکر" میں رقمطراز ہے:

"انسان کے لیے صرف خوراک ہی ضروری نہیں، وہ صرف مروت اور ہمدردی کا ہی محتاج نہیں، بلکہ اس کے اندر روحانی احساسات و جذبات بھی موجزن ہیں۔ وہ اپنے اندر کچھ تخلیقی صلاحیتیں رکھتا ہے اور اپنے دل میں کچھ آرزوئیں اور تمنائیں بھی پالتا ہے۔ اگر ان غیر مادی قوتوں کی صحیح انداز سے نشوونما نہ کی جائے تو انسان کا مقصدِ تخلیق ہی فوت ہو جاتا ہے اور انسان پھر انسان کہلانے کا مستحق نہیں رہتا . . . . . یہی چیز انسانوں اور حیوانوں کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔ میں یہ بات پورے زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ حیوانوں کے اندر روحانی احساسات ناپید . . . ہیں اور انسان انہی کے بل بوتے ہی پر دنیا میں جیتا اور ترقی کرتا ہے۔"[1]

یہی درحقیقت وہ نازک مقام ہے جس میں انسان وحی اور الہام کا محتاج ہے۔ وہ جب اپنے طور پر صرف عقل کی مدد سے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے تو داخلی زندگی کے تقاضوں کو یکسر بھول جاتا ہے اور اس حقیقت کو پوری طرح نظر انداز کر دیتا ہے کہ اس عالمِ مجاز و محسوسات سے بالا، ہمارے نظامِ کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام بھی موجود ہے جس کی منشا کے مطابق اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنا حیاتِ انسانی کا ایک فطری داعیہ ہے، اور

[1] ایضاً ص ۲۷-۲۸

اس کے برعکس وہ جب داخلی زندگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خارجی زندگی کے سارے مطالبات اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس کے روحانی تجربات خواہ اُس کی ذات کے لیے کتنے ہی قیمتی اور پُرکیف ہوں لیکن وہ ان کی بنیاد پر کوئی ایسا نظامِ فکر و عمل تشکیل نہیں کر سکتا جو خارجی زندگی کے تقاضوں کو پُورا کر سکے۔ اس کے ان تجربات میں داخلیت اور انفرادیت کا رنگ غیر معمولی حد تک نمایاں ہوتا ہے اور اس لیے ان کے اندر معروضی اقدار، جو کسی صالح نظامِ تہذیب کی تعمیر کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، کی تلاش بالکل عبث اور بیکار ہے۔

"روحانی عقلیت" یا "عقلی روحانیت" یا دوسرے الفاظ میں ایک ایسا روحانی کیف جو معروضی اقدار کا حامل ہو اور اپنے اندر یہ قوت اور صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ انسان کو ایک طرف کائنات کے روحانی اور اخلاقی نظام سے ہم آہنگ کر دے اور دوسری طرف اس بنیاد پر انسانی عقل و خرد کی بھی نہایت کامیابی کے ساتھ رہنمائی کر سکے، انسانی فطرت کا ایک بنیادی مطالبہ ہے اور یہ چیز صرف وحی اور الہام سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

ممکن ہے یہاں انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ انسان اپنی ذہنی کاوش سے "روحانی عقلیت" کیوں نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کی تین وجوہات ہیں:-

(۱) انسان کے لیے از خود روحانیت اور عقلیت کے درمیان توازن قائم کرنا بالکل ناممکن ہے۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اس بات پر مجبور رہے کہ کسی ایک طرف جھک جائے۔ وہ جب عقلیت کو روحانیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے گا تو عقلیت کی بنیادوں کو ہی متزلزل کر دے گا اور دوسری طرف جب روحانیت کو عقلی اساس فراہم کرنے کے لیے آگے بڑھے گا تو اس کی کوئی ایسی توجیہ کرے گا جس سے انسان کے روحانی تجربات کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہے گی۔ دورِ جدید کے ماہرینِ نفسیات انسان کے لطیف روحانی احساسات کی جس انداز سے تذلیل کر رہے ہیں اُسے دیکھ کر اس قسم کی احمقانہ کوششوں کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ روحانیت ایک داخلی تجربہ ہے اور اس وجہ سے اس کی کیفیت کو وہی شخص اچھی طرح جان سکتا ہے جو خود

سب سے پہلے ایک جیتا جاگتا، فروزاں شعلۂ احساس اپنے قلب کے اندر پیدا کرے، محض دقتِ نظر اور نظری علمیت سے اس کا تجزیہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ لیکن ہمیں عقل کے ان دعویداروں کی جسارت دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کے لطیف تاثرات اپنے سینے میں پائے بغیر وہ ان کی نفسیاتی تحلیل شروع کر دیتے ہیں اور ان کی ایسی توجیہات پیش کرتے ہیں جن سے ان تجربات کی معنویت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کی ان روحانی کیفیات کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو گا کہ خدا کے خوف میں بہنے والے آنسوؤں کو اور اپنی سیاہ کاریوں پر گرنے والے اشک ہائے ندامت کو محض غدودوں کی رطوبت قرار دے دیا جاتے۔ جو عقلیت "وارفتگیٔ شوق" کو قشر کے کیمیاوی تغیرات سے تعبیر کرتی ہے اور عشقِ الٰہی سے پیدا ہونے والے "جذب و دروں" کو "مراکزِ تلازمِ خیالات کا اختلال" سمجھتی ہے وہ انسان کے ان اعلیٰ اور ارفع احساسات کے ساتھ کبھی بھی انصاف کا برتاؤ نہیں کر سکتی۔ وہ ہمیشہ اس ٹوہ میں لگی رہتی ہے کہ کسی طرح علم کے ان روحانی اور سرمدی چشموں کو گدلا قرار دے کر لوگوں کو ان سے برگشتہ کیا جا تے۔

(ب) اگر بالفرض ہم چند لمحوں کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیں کہ عقلیت کے اندر چند روحانی عناصر کو شامل کیا جا سکتا ہے یا روحانیت میں عقلی اجزا کی آمیزش ممکن ہے تو پھر بھی یہ دقت اپنی جگہ پر موجود رہتی ہے کہ روحانیت اور عقلیت کے اس مغلوبے میں آمیزش کی شرح کیا ہو۔ یہ مسئلہ بھی بڑا ہی پیچیدہ ہے اور انسان از خود اسے کسی طرح حل نہیں کر سکتا۔

اس آمیزش میں اگر عقلیت کے اجزا زیادہ طاقتور ہوں گے تو وہ روحانی عناصر میں سے اُن کا اصل جوہر نکال کر انہیں بالکل اپنے رنگ میں رنگ لیں گے اور اس طرح روحانیت عقلیت میں شامل ہونے کے باوجود اثرات اور نتائج کے اعتبار سے بالکل بیکار رہے گی۔

پھر اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ دو اَن مِل اور بے جوڑ عناصر کی آمیزش بھی کبھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی۔ ان دونوں کے اجتماع سے کوئی ایسا روحانی اور فکری نظام معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا جو قلب و نظر دونوں کے لیے تسکین کا باعث ہو۔ اس قسم کی جو کوشش کی بھی

جائے گی، فکری انتشار اور قلبی اضطراب پر منتج ہو گی۔

(ج) اس راہ کی سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ روحانی تجربات خواہ انوار و تجلیات کے اعتبار سے کتنے ہی پرکیف ہوں اور بصیرت افروزی کے لحاظ سے محسوسات سے کہیں زیادہ وزنی، لیکن انہیں اپنی اسی لطیف حالت کے ساتھ خارج میں منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان روحانی احساسات میں ایک ایسی گہری اتفاقی کیفیت پائی جاتی ہے جس کی صداقت کو منطق اور فلسفہ متزلزل نہیں کرسکتے اور جو لوگ اس نوعیت کے روحانی احساسات سے لذت آشنا ہوتے ہیں اُن کے اندر ایک ایسا ایقان پیدا ہو جاتا ہے جو حسّی تجربات اور منطقی نتائج سے کہیں زیادہ پختہ اور پُرمعنی ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ان روحانی کیفیات کی مدد سے خارجی اور مادی زندگی کے لیئے کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کرنا جو دل و دماغ اور عقل و وجدان دونوں کے لیے رُشد و ہدایت کا کام دے بالکل ناممکن ہے۔

تاریخِ انسانی میں وحی و الہام سے بے نیاز ہو کر، اس قسم کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں وہ ہر لحاظ سے ناکام ثابت ہوئیں۔ اس نوعیت کے "مرکبات" میں کبھی کوئی تخلیقی قوت پیدا نہیں ہوسکی۔ ان کے استعمال سے نوعِ بشری کو ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی معاشرے نے روحانیت اور مادیت کے درمیان پیوند لگانے کی سعی کی توحیاتِ انسانی کے اندر زبردست انتشار اور اختلال رونما ہوا۔ سب سے پہلے تو سوسائٹی میں ایسے لوگ اُبھر کر سامنے آئے جو اپنی خلوتوں میں تو اشراقی اور روحانی تھے لیکن اجتماعی معاملات کو خالص مادہ پرستانہ نظریات کے ساتھ حل کرنے کے لیے کوشاں تھے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا تو پھر سوسائٹی دو مختلف طبقوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک وہ طبقہ جو دنیا اور اُس کے مسائل سے یکسر بے تعلق ہو کر صرف گیان دھیان میں منہمک رہتا اور دوسرا وہ طبقہ جو نیکی، شرافت، خوفِ خدا سے بالکل عاری تھا لیکن اُس نے اجتماعی معاملات کی زمامِ کار سنبھال رکھی تھی۔ اس قسم کی تقسیم سے معاشرے کو جس نوعیت کے نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ اگر ان کی تفصیل درکار ہو تو لیکی کی مشہور کتاب تاریخِ اخلاق یورپ پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ اس سے صورتِ حال کا

بآسانی اندازہ ہو سکے گا۔

انسان میں درحقیقت فطری اعتبار سے یہ صلاحیت موجود نہیں کہ وہ از خود روحانیت اور عقلیت کی آمیزش سے کوئی ایسا مرکب تیار کر سکے جو اُس کے وجدان و ایمان اور عقل و فکر دونوں کے معیار پر پورا اترتا ہو۔

یہ صلاحیت خداوند تعالیٰ صرف انبیاء علیہم السلام کو عطا فرماتا ہے کہ وہ روحانی تجربات کو پوری صحت اور صفائی کے ساتھ خارجی زندگی میں منتقل کر کے ایک پاکیزہ تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھیں۔ اُن کے پیش کردہ نظامِ فکر و عمل میں روحانیت اور مادیت کا پیوند نہیں لگا ہوتا۔ بلکہ روحانی نظام ہی اتنا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کا پوری طرح احاطہ کر کے اُن کے اندر وحدت اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس طرح روحانیت اور مادیت کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا اگر اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان نفوسِ قدسیہ نے جب آفاق پر بحث کی تو انفس کے لطیف تاروں کے اندر خود بخود ارتعاش پیدا ہو گیا اور جب انفس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر اُس کے تاثرات پر اظہارِ خیال شروع کیا تو خود عقل پر وجد طاری ہو گیا اور اُس نے پورے جوش اور اعتماد سے ان کی صحت کی تصدیق کی۔

عقلیت اور روحانیت کی دوئی کا مٹا دینا ہی درحقیقت معجزاتِ نبوت میں سے ایک زبردست معجزہ ہے:

انجامِ خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہائے بے صوت ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دل در سخنِ محمدی بند اے پورِ علی ز بوعلی چند

(اقبال)